درس
١
مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب
نجات کی راہ
سورۃ العصر کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمد
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نام کتابچہ ——— نجات کی راہ (درس نمبر۱)

طبع اوّل تا چہارم (دسمبر 2002ء تا جولائی 2010ء) ——— 7700

طبع پنجم (اکتوبر 2010ء) ——— 2200

ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-35869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— 20 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

درس ۱

لوازمِ نجات

سورۃ العصر کی روشنی میں

نحمدهٗ ونصلی علیٰ رسولهِ الكريم ...... اَمَّا بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣﴾ ...... صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

مطالعۂ قرآنِ حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار بیان ان نشستوں میں ہوگا اس کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے' بلکہ اس نصاب کا پورا تانا بانا بھی اسی سورۂ مبارکہ کے گرد گھومتا ہے۔ اس لئے کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے نہایت اختصار لیکن انتہائی جامعیت کے ساتھ انسان کی نجات کے لوازم اور اس کی فلاح اور کامیابی کی شرائط کو بیان کر دیا ہے۔ یعنی ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔

ان چاروں لوازمِ نجات یا شرائطِ نجات کی تشریح و توضیح ہمیں قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے ملتی ہے ___ جن میں سے چیدہ چیدہ مقامات کو اس نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ منتخب نصاب چھ حصّوں پر مشتمل ہے:

۱) پہلے حصّہ میں سورۃ العصر کے علاوہ چند اور مقامات ایسے شامل ہیں جن میں ان تمام لوازمِ نجات کا بیان جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔

۲) دوسرے حصّہ میں ایمان کے مباحث کسی قدر تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔

۳) تیسرا حصّہ اعمالِ صالحہ کی تفاصیل پر مشتمل ہے۔ انفرادی سیرت و کردار' گھریلو اور

عائلی زندگی، سماجی و معاشرتی زندگی سے متعلق ہدایات اور سب سے آخر میں مسلمانوں کی ملّی اور سیاسی زندگی سے متعلق ہدایت اور رہنمائی، اس تیسرے حصہ کے مضامین ہیں۔

۴) چوتھا حصہ تواصی بالحق کے اعلیٰ مراتب پر مشتمل ہے، یعنی شہادت علی الناس، غلبۂ دین حق اور اس کے لئے جدوجہد، جس کے لئے قرآن مجید کی جامع اصطلاح ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے، اس حصہ کے اہم مضامین ہیں۔

۵) پانچواں حصہ قرآن حکیم کے اُن مقامات پر مشتمل ہے جو صبر و مصابرت کی تلقین سے متعلق ہیں۔

٦) چھٹا اور آخری حصہ قرآن مجید کی ایک نہایت جامع سورۃ یعنی سورۃ الحدید پر مشتمل ہے کہ جس میں پھر اُن سب تعلیمات کو یکجا جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

چار تمہیدی باتیں

اس مختصر تمہید کے بعد اَب ہم اللہ کا نام لے کر سورۃ العصر پر غور وفکر کا آغاز کرتے ہیں۔اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چار باتیں تمہیداً نوٹ کر لینی چاہئیں:

پہلی یہ کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن حکیم کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے۔اس لئے کہ یہ کُل تین آیات پر مشتمل ہے اور قرآن مجید میں کوئی سورۃ تین سے کم آیات پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ کُل تین ہی سورتیں قرآن مجید میں ایسی ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔انہی میں سے ایک سورۃ العصر ہے اور اتنی مختصر ہے کہ اس کی پہلی آیت صرف ایک لفظ پر مشتمل ہے، یعنی ''وَالْعَصْرِ''۔

دوسرے یہ کہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی اوّلین سورتوں میں سے ایک ہے۔قرآن نے اپنے بارے میں سورۂ ھود میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں اور اس کے بعد اُن کی تفصیل بیان کی گئی۔فرمایا گیا: ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴾(ھود:۱)۔گویا ابتداءً قرآنِ مجید میں وہ سورتیں اور آیتیں نازل ہوئی ہیں

جو انتہائی جامع ہیں اور اس کے بعد انہی کی تفصیل لمبی سورتوں میں وارد ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے گویا سورۃ العصر کا شمار بھی ان انتہائی جامع سورتوں میں ہوتا ہے جو ابتداء میں نازل کی گئیں۔

تیسری بات یہ کہ اگر چہ ویسے تو پورا قرآن مجید عربی ادب کی معراج اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے' لیکن طالبانِ قرآن جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے مختلف مقامات ادبیت اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مختلف اور منفرد کیفیات کے حامل ہیں۔ گویا معاملہ وہی ہے کہ ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است''۔

اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سورۃ العصر کی انفرادی شان یہ ہے کہ یہ سورۃ قرآن حکیم میں سہل ممتنع کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ انتہائی دقیق اور اعلیٰ علمی مضامین نہایت سادہ الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔ کوئی بھاری بھرکم لفظ یا کوئی ثقیل اصطلاح اس سورۂ مبارکہ میں وارد نہیں ہوئی۔ تاہم اس کی سلاست کے پردوں میں علوم و معارف کے دریا موجزن نظر آتے ہیں۔ اس حقیقت پر غور و فکر کے نتیجے میں واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے اعجاز اور اُس کی عظمت کے سامنے انسان کا سر بے اختیار جھک جاتا ہے۔

جامع ترین سورۃ

تمہیدی امور میں سے چوتھی' آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی جامع ترین سورۃ ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید کا مقصدِ نزول ہدایت و رہنمائی ہے۔ اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ بتانا اور صراطِ مستقیم اور سواء السبیل کی طرف رہنمائی کرنا قرآن مجید کا مقصدِ نزول ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے سورۃ العصر قرآن مجید کی جامع ترین سورۃ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک ایسے بیج کی مانند ہے کہ جس میں قرآن مجید کا پورا شجرۂ طیبہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں حضرت ابومزینہ دارمیؓ کی یہ روایت طبرانی کی ''معجم الاوسط'' میں اور امام بیہقی کی ''شعب الایمان'' میں منقول ہے کہ:

كَانَ الرَّجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ اِذَا الْتَقَيَا لَمْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَقْرَأَ اَحَدُهُمَا عَلَى الْاٰخَرِ سُوْرَةَ الْعَصْرِ ثُمَّ يُسَلِّمُ اَحَدُهُمَا عَلَى الْاٰخَرِ

''نبی اکرم ﷺ کے اصحابؓ میں سے کوئی سے دو صحابہ جب بھی باہم ملاقات کرتے تھے وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے جب تک کہ ایک دوسرے کو سورۃ العصر سنا نہ لیں' اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے اور ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو اس سورۂ مبارکہ کے ساتھ کس قدر قلبی اُنس تھا۔

ائمہ اربعہ میں سے امام شافعیؒ کا ایک قول اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں ملتا ہے جسے حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

''لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ''

''اگر لوگ صرف اس ایک سورۃ پر غور و فکر کریں تو یہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی ہو جائے۔''

امام شافعی کا ایک اور قول مفتی محمد عبدہٗ نے تفسیر پارہ ''عَمَّ'' میں نقل کیا ہے' جس کی رو سے امام شافعی فرماتے ہیں:

''لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْاٰنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ''

''اگر قرآن مجید میں سوائے سورۃ العصر کے کچھ اور نازل نہ ہوتا تو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے یہی کافی ہوتا۔''

ان دو اقوال سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امام شافعیؒ کی نگاہ میں اس سورۃ کی عظمت اور اس کا مقام کیا تھا!

دورِ حاضر میں بھی بہت سے اصحابِ علم و فضل نے اس سورۂ مبارکہ کی عظمت کو پہچانا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالباری ندوی نے اس سورۂ مبارکہ کی بنیاد پر ''مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت'' کے عنوان سے ایک خاصی ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ امام حمید الدین فراہیؒ نے اس سورۂ مبارکہ کو قرآن مجید کے جوامع الکلم میں سے شمار کیا ہے۔ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ جہاں تک صراطِ مستقیم اور سواء السبیل کی نشاندہی اور انسان

کے لوازمِ فوز و فلاح اور شرائطِ نجات کے بیان کا تعلق ہے‘ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی جامع ترین سورۃ ہے۔ جس طرح توحید کے بیان میں سورۃ الاخلاص قرآن مجید میں نہایت اہمیت کی حامل ہے‘ اور اسی وجہ سے اُس کو قرآن مجید کی عظیم ترین سورۃ قرار دیا گیا ہے‘ بالکل اسی طرح قرآن مجید کے مقصدِ نزول یعنی لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے اعتبار سے اور صراطِ مستقیم کے سنگ ہائے میل کی نشاندہی کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ انتہائی جامعیت اور عظمت کی حامل ہے۔

عبارت کا تجزیہ

اس سورۂ مبارکہ پر اگر غور کیا جائے اور اس کا ترجمہ سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ اگرچہ اس کی آیات تین ہیں لیکن ان تینوں کو جوڑنے سے ایک سادہ جملہ (simple statement) وجود میں آتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی درمیانی آیت ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۞﴾ نہ صرف یہ کہ عددی اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت قرار پاتی ہے بلکہ مضمون کے اعتبار سے بھی مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انسان کے خسارے اور گھاٹے‘ اور اس کی ہلاکت و بربادی کا ایک عجیب مایوس کن نقشہ سامنے آتا ہے۔ پہلی آیت ایک قَسم پر مشتمل ہے جس سے نہ صرف یہ کہ زورِ بیان میں اضافہ ہوا ہے بلکہ آیت ۲ میں بیان شدہ حقیقت میں مزید تاکید کا مفہوم بھی پیدا ہوگیا ہے۔ یہ دونوں آیات مل کر ایک قاعدۂ کلیہ کے بیان کی حیثیت اختیار کرتی ہیں جس سے ایک استثناء کو تیسری آیت بیان کر رہی ہے۔ گویا بالفاظ دیگر پہلی آیت محض ایک قَسم پر مشتمل ہے‘ اور سیدھی سی بات ہے کہ قَسم کا مفہوم واضح نہیں ہوسکتا جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ قَسم کس بات پر کھائی جارہی ہے۔ اسی طرح تیسری اور آخری آیت ایک استثناء پر مشتمل ہے اور اس استثناء کا مفہوم بھی واضح نہیں ہوتا جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ استثناء کس سے کیا جارہا ہے‘ وہ قاعدہ کلیہ کون سا ہے کہ جس سے یہ استثناء بیان ہو رہا ہے! اس طرح یہ تینوں آیات مل کر ایک سادہ جملے کی شکل اختیار کرتی ہیں: ﴿وَالۡعَصۡرِ﴾ ’’زمانہ کی قسم ہے‘‘ ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۞﴾ ’’یقیناً تمام

انسان گھاٹے اور خسارے میں ہیں" ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ "سوائے اُن کے جو ایمان لائے" ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ "اور انہوں نے نیک عمل کئے (بھلے عمل کئے)" ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ "اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی" ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ "اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔"

اس جملے کو اگر ہم اپنے غور و فکر کا موضوع بنائیں' یا یوں کہہ لیجئے کہ اپنے لوحِ قلب پر اسے نقش کر لیں یا اپنے لوحِ ذہن پر کندہ کر لیں اور اس پر ذرا سا غور کریں تو چار باتیں بادنیٰ تأمل ہمارے سامنے آئیں گی۔

زورِ کلام —— تاکید کی انتہا

سب سے پہلی بات یہ کہ اس میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ انتہائی مؤکد پیرائے میں ہے۔ اس لئے کہ اوّلاً اس سورۂ مبارکہ کا آغاز ایک قَسم سے ہو رہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قَسم ہمیشہ تاکید کے لئے کھائی جاتی ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کو اللہ کا کلام ماننے اور اس پر ایمان رکھنے والوں کے لئے محض اللہ کا فرمانا ہی انتہائی تاکید کا حامل ہے کہ ع "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا!" لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کسی بات کو مزید مؤکد کرنا چاہتے ہیں وہاں اس کے آغاز میں مضمون کی نسبت سے کسی قَسم کا اضافہ فرما دیتے ہیں۔ ثانیاً آیت ۲ کا آغاز ایک حرفِ تاکید سے ہو رہا ہے۔ عربی زبان سے معمولی سی واقفیت رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ حرف "اِنَّ" تاکید کے لئے آتا ہے جس کا ترجمہ بالعموم ہوتا ہے تحقیق' یقیناً' بلا شک و شبہ۔ پھر اسی آیت میں لامِ تاکید کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ "لَفِیْ خُسْرٍ" میں "ل" تاکید کا فائدہ دے رہا ہے۔ تاکید کے مزید کئی اسالیب بھی اس سورۂ مبارکہ میں اختیار کئے گئے ہیں' لیکن اندیشہ ہے کہ یہاں اُن کا بیان کچھ ثقالت کا حامل ہو جائے گا۔ تاہم عربی دان حضرات جانتے ہیں کہ عربی زبان میں کسی کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے جتنے ممکن اسالیب ہیں وہ سب کے سب اس مختصر سی سورۃ میں جمع کر دیئے گئے ہیں' جو نحوی اعتبار سے ایک سادہ جملے پر مشتمل ہے۔

کامیابی اور ناکامی کا قرآنی معیار

دوسری بات جو اس سورۂ مبارکہ پر معمولی سے غور و فکر کے نتیجے میں سامنے آتی ہے' بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس جامِ حقیقت نما سے از خود چھلک رہی ہے' یہ ہے کہ اس میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کا ایک معیار وارد ہوا ہے۔ ہر شخص جو اِس دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے' بھاگ دوڑ' سعی و جہد اور محنت و مشقت کر رہا ہے' کامیابی کا کوئی نہ کوئی معیار اس کے سامنے ہے۔ اور اگر ہم تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اکثر و بیشتر دنیا میں کسی انسان کی کامیابی کے جو معیارات معروف ہیں ان میں دولت و ثروت ہے' حیثیت و وجاہت ہے' شہرت و ناموری ہے یا کاروبار و جائداد ہے۔ ان چیزوں سے بالعموم کسی انسان کی کامیابی یا ناکامی کو ناپا جاتا ہے۔ لیکن اس سورۂ مبارکہ میں اس کے بالکل برعکس تصور سامنے آتا ہے کہ انسان کی کامیابی نہ دولت و ثروت سے ہے' نہ شہرت و ناموری سے ہے' نہ حیثیت و وجاہت سے ہے' نہ دُنیوی اقتدار و غلبے سے' بلکہ انسان کی کامیابی کے چار لوازم ہیں۔ یعنی ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر!

گویا اگر کسی انسان کے پاس نہ دو وقت پیٹ بھرنے کے لئے کچھ موجود ہو' نہ تن ڈھانپنے کے لئے مناسب لباس اسے میسر ہو' اور نہ سر چھپانے کے لئے کوئی چھت اسے حاصل ہو' لیکن ایمان کی دولت' عمل صالح کی پونجی اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے اس کا دامن بھرا ہوا ہو تو وہ انسان از روئے قرآن واز روئے سورۃ العصر ایک کامیاب انسان قرار پائے گا۔ اس کے برعکس کسی کے پاس خواہ نمرود اور فرعون کی سی بادشاہی ہو' قارون کا سا خزانہ ہو یا دنیا کی دوسری تمام نعمتیں انتہائی کثرت اور بہتات کے ساتھ جمع ہو گئی ہوں' لیکن اگر وہ دولتِ ایمان سے محروم ہے' اعمالِ صالحہ کی پونجی سے تہی دامن ہے' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے عاری ہے تو وہ شخص از روئے سورۃ العصر ناکام ہے' خائب و خاسر اور نامراد ہے۔

اس حقیقت کو جان لینا شاید اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اس پر دل کا جم جانا دشوار ہے۔ اس لئے کہ انسان اس دنیا میں اپنے گردو پیش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی

وقت کوئی چمکیلی شوخ رنگ کی نئے ماڈل کی کار کسی کے پاس سے زنّاٹے کے ساتھ گزر جاتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اعصاب میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عالی شان محل کے سامنے سے گزر ہو جس میں زندگی کی تمام آسائشیں فراہم ہوں تو نفسِ انسانی اس سے تأثر قبول کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے یہاں کی چمک دمک اور رونقوں سے متاثر ہونا انسان کی خلقی کمزوریوں میں سے ایک ہے' لہٰذا ضرورت ہے کہ کامیابی و ناکامی کے اس قرآنی معیار کو ایک دفعہ مان لینے کے بعد اس کا بار بار اعادہ کیا جاتا رہے' اس حقیقت کی طرف وقفے وقفے سے ذہن کو منتقل کیا جاتا رہے اور اس کی بکثرت یاددہانی ہوتی رہے۔ یہی وہ بات ہے جو صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل سے سامنے آتی ہے اور اس سوال کا واضح جواب ہمارے سامنے آتا ہے کہ آخر وہ کیوں ہر ملاقات کے موقع پر ایک دوسرے کو سورۃ العصر سنایا کرتے تھے! اسی لئے کہ یہ حقیقت ذہن میں مستحضر رہے کہ انسان کی کامیابی دولت و جائداد' دنیاوی اقتدار اور شہرت و ناموری سے نہیں ہے بلکہ اس کی کامیابی کے لوازم بالکل دوسرے ہیں' یعنی ایمان' اعمالِ صالحہ' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔

نجات کی کم از کم شرائط کا بیان

تیسری بات جو اس سورۂ مبارکہ پر معمولی سے غور و فکر سے واضح ہو جاتی ہے' یہ کہ اس سورۃ میں انسان کی کامیابی کے اعلیٰ مراتب کا ذکر نہیں ہے' بلکہ یہاں محض ادنیٰ درجے میں کامیابی کا بیان ہے۔ اس میں محض خسارے اور گھاٹے سے بچ جانے کی شرائط کو بیان کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ کم از کم لوازمِ نجات ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ انسان کی کامیابی کی کم سے کم شرائط ہیں جن سے کم تر پر نجات کا کوئی تصور نہیں! اس لئے کہ اگر یوں کہا گیا ہوتا کہ ان لوگوں کو بڑے اعلیٰ مراتب نصیب ہوں گے جن میں مذکورہ بالا چاروں صفات موجود ہوں گی تو پھر امکانی طور پر یہ خیال ذہن میں آ سکتا ہے کہ کامیابیٔ محض کے حصول اور ناکامی سے بچنے کے لئے اس سے کم تر پر قناعت کی جا سکتی ہے۔ یعنی چار کی بجائے دو شرائط کو پورا کرنے پر بھی ہلکے درجے کی کامیابی کی امید

کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں جو اُسلوب اختیار کیا گیا اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ انسان کی کامیابی کا کم سے کم تقاضا اور اس کی فوز و فلاح کے کم سے کم لوازم ہیں جو اس سورۂ مبارکہ میں بیان ہوئے۔

چاروں شرطیں لازمی ہیں!

چوتھی، آخری اور اہم ترین بات جو اِس سورۂ مبارکہ پر غور و فکر سے انسان کے سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ یہاں جو لوازمِ نجات بیان ہو رہے ہیں اور جن سے انسان کی کامیابی کو مشروط قرار دیا گیا ہے وہ سب کے سب ناگزیر ہیں، ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ کلامِ الٰہی ہے۔ اس کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا، نَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ ذٰلِكَ کہ ع ''بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے'' والا کوئی معاملہ اس میں کیا گیا ہو یا محض ردیف اور قافیے کی ضرورت کے تحت کچھ اضافہ کر دیا گیا ہو۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ اٹل ہے، اس میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ جوں کی توں حقیقت ہے، اس میں کسی قطع و برید اور کسی کمی و بیشی کی کوئی گنجائش ہے نہ امکان! اس لئے کہ یہ کلام اللہ ہے۔

دیکھئے، اگر کوئی معالج کسی مریض کو چار اجزاء پر مشتمل ایک نسخہ لکھ کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ چاروں اجزاء ہی اس نسخہ کے لازمی اجزاء ہوں گے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک جزو میں اگر کوئی مضرت بخش پہلو ہو تو دوسرا جزو اس میں مصلح کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی مریض اپنی مرضی سے اس نسخہ میں سے کسی جزو کو ساقط کر دے تو یہ بات طے شدہ ہے کہ اب یہ نسخہ اس معالج یا حکیم کا نسخہ نہیں رہا، بلکہ اب اس کی ذمہ داری اُس شخص پر ہے جس نے اس میں قطع و برید یا کمی بیشی کی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اب وہ نسخہ نسخۂ شفا نہ رہے بلکہ نسخۂ ہلاکت بن جائے۔

ایک مغالطے کا ازالہ

قرآن مجید کی اس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی نجات کو چار شرائط سے مشروط کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چاروں شرائط ناگزیر اور ضروری ہیں، ان میں سے

کسی ایک شرط کو بھی ساقط کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ یہ بات اس پہلو سے بہت اہم ہے کہ اس وقت اُمت مسلمہ عملی اعتبار سے جس تنزّل اور انحطاط کا شکار ہے اس کا ایک بڑا سبب بھی یہی ہے کہ اُن کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ صرف ایمان ہی نجات کے لئے کافی ہے' بلکہ ایمان کا بھی صرف قانونی پہلو جو اقرارٌ باللِّسان سے متعلق ہے' انسان کو جنت کا حق دار بنانے کے لئے کافی ہے۔ یہ مغالطہ آج اُمت مسلمہ کی ایک عظیم اکثریت کے ذہنوں میں بیٹھ گیا ہے کہ کلمہ گو بہرحال نجات پا جائے گا' خواہ اس کلمے کے لئے جو اُسے وراثتاً مل گیا ہے' اس نے نہ تو کوئی محنت کی ہو' نہ ترک و اختیار کے کسی مرحلہ سے اسے گزرنا پڑا ہو اور نہ ہی کلمے کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کی جانب اس نے کبھی کوئی توجہ دی ہو۔

جب انسان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ تو بخشا بخشایا ہے اور نجات و کامیابی اس کا موروثی حق ہے اور اسے از خود حاصل ہے تو ظاہر ہے کہ پھر عملی کھکھیڑ مول لینے' مشکلات اور دینی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کی کوئی ضرورت اسے محسوس نہیں ہوتی۔ اسی مغالطے نے اُمت مسلمہ کو عمل سے یکسر فارغ کر دیا۔ بقول علامہ اقبال ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی؟
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

جہاں تک تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا تعلق ہے' اُمت مسلمہ بحیثیت مجموعی انہیں یکسر فراموش کر چکی ہے۔ دعوت الی اللہ' تبلیغ دین' امر بالمعروف و نہی عن المنکر' جہاد فی سبیل اللہ' شہادت علی الناس' یہ تمام فرائض تو گویا مسلمانوں کے تصورِ دین سے بالکل خارج ہو چکے ہیں۔ ان کے بارے میں تو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید یہ صرف ایک مخصوص طبقہ کی ذمہ داری ہے' عام مسلمان پر اس کا کوئی بوجھ ہے نہ وہ اس کے لئے مکلّف ہے۔ ان تمام تصورات کی ایک بھرپور نفی اس سورۂ مبارکہ کے چند الفاظ کے ذریعے کی گئی ہے۔ فرمایا:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

یعنی ''زمانہ اس پر گواہ ہے کہ تمام انسان خسارے اور گھاٹے سے دوچار ہوں گے' ماسوائے ان کے کہ جو چار شرطیں پوری کریں: ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر''۔

یہی وجہ ہے کہ امام رازیؒ نے اپنی مشہورِ زمانہ تفسیر میں سورۃ العصر کے ضمن میں یہ جامع الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

اِعْلَمُوْا اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ فِيْهَا وَعِيْدٌ شَدِيْدٌ' لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَكَمَ بِالْخَسَارِ لِجَمِيْعِ النَّاسِ' اِلَّا مَنْ كَانَ آتِيًا بِهٰذِهِ الْاَشْيَاءِ الْاَرْبَعَةِ: وَهِيَ الْاِيْمَانُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ وَالتَّوَاصِيْ بِالْحَقِّ وَالتَّوَاصِيْ بِالصَّبْرِ' فَدَلَّ ذٰلِكَ عَلٰى اَنَّ النَّجَاتَ مُعَلَّقَةٌ بِمَجْمُوْعِ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ

''جان لو کہ اس آیت میں بڑی شدید وعید وارد ہوئی ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خسارے' گھاٹے اور تباہی کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے پوری نوعِ انسانی کے لئے' سوائے اُن کے جو اِن چار چیزوں کا اہتمام کریں (ان چار شرائط کو پورا کریں) یعنی ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ چنانچہ اس سے اس جانب رہنمائی ملتی ہے کہ نجات کا دارومدار ان چاروں چیزوں کے مجموعہ پر ہے''۔

معقولیت کا تقاضا!

ان چار باتوں کے مابین جو منطقی ربط ہے اس کو ایک عام مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں کسی بھی اہم معاملے میں جو کسی انسان کو پیش آئے' صحیح طرزِ عمل یہ ہوگا کہ انسان اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرے کہ حقیقت کیا ہے۔ پھر جب حقیقت اس پر منکشف ہو جائے تو ایک معقول انسان کی روش یہ ہوگی کہ وہ اسے قبول کرے' تسلیم کرے۔ اور اگر اس کے قبول کرنے میں کسی کی ناراضگی مول بھی لینی پڑتی ہو یا کچھ ذاتی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہو تب بھی اسے قبول کرنے سے نہ رکے' اس لئے کہ وہ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اگلا قدم یہ ہوگا کہ جس حق کو اس نے قبول کیا ہے اس کا اعلان بھی کرے' اس کی طرف لوگوں کو بلائے۔ اور آخری

مرحلے کے طور پر اِس معاملہ میں خواہ اسے مخالفت کا سامنا ہو، خواہ اس کا تمسخر ہو اور خواہ اس کو جان کے لالے پڑ جائیں وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہے اور اس کی طرف لوگوں کو بلاتا رہے۔

سقراط کا واقعہ ہمیں معلوم ہے کہ چند حقائق اس پر منکشف ہوئے۔ اس نے ان کو نہ صرف خود قبول کیا بلکہ ان کا اعلان بھی کیا۔ اس راہ میں اسے زہر کا پیالہ بھی پینا پڑا۔ لیکن اس نے اعتراف واعلانِ حق سے منحرف ہونے کی بجائے اپنی زندگی کو قربان کر دینا مناسب سمجھا۔ ہر معقول اور صاحب سیرت و کردار انسان کے لئے یہی ایک روش ہے جو اسے اختیار کرنی چاہیئے۔ جس مرحلہ پر بھی انسان اس معقول روش کو چھوڑ کر اپنی سیرت و کردار کے بودے پن کا مظاہرہ کرے گا تو وہ گویا اس بات کا ثبوت دے گا کہ وہ محض صورتاً ایک انسان ہے، حقیقی انسانیت سے بہرہ ور نہیں ہے۔

تو یہ وہ چند حقیقتیں ہیں کہ جو اِس سورۂ مبارکہ سے گویا از خود چھلک رہی ہیں۔ ذرا سے تأمل اور غور و فکر سے انسان اِن تک بآسانی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ الغرض یہ اِس سورۂ مبارکہ کی وہ بنیادی رہنمائی ہے جو بطریق تذکّر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہمیں ذرا مزید گہرائی میں اتر کر اس کے مضامین پر غور و فکر کرنا ہے۔

فہم قرآن کے دو درجے

اس مرحلہ پر یہ بات بھی ذہن میں بٹھا لیجئے کہ فہم قرآن کے دو درجے ہیں: ایک ہے تذکّر بالقرآن اور دوسرا ہے تدبّر بالقرآن۔

تذکر بالقرآن یہ ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت یا سورۃ سے اس کا اصل سبق اخذ کر لیا جائے۔ اس پہلو سے قرآن مجید ایک بہت آسان اور کھلی کتاب ہے۔ قرآن مجید خود دعویٰ کرتا ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝

''ہم نے قرآن کو تذکّر کے لئے آسان کر دیا ہے، تو ہے کوئی جو اِس سے نصیحت اخذ کرنا چاہے؟''

تدبّر کے معنی غور وفکر کے ہیں۔ یعنی قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ میں غوطہ زنی کرنا اور لغت و بیان کے ہر ہر پہلو کو مدّ نظر رکھتے ہوئے غور وفکر کا حق ادا کرنے کی کوشش کرنا۔ اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی گہرائیاں اتھاہ ہیں۔ اس پر غور وفکر کا حق ادا کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔ پوری پوری زندگیاں کھپانے کے باوجود کوئی انسان کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس قرآن کی گہرائیوں کو ناپ لیا ہے۔

نوعِ انسانی کا المیہ ——ایک عظیم خسارے سے سابقہ

سورۃ العصر پر اگر بطریق تدبّر غور کیا جائے تو اس کی مرکزی اور درمیانی آیت سے نوعِ انسانی کی ایک عجیب اَلمیاتی (Tragic) کیفیت سامنے آتی ہے۔ انسان کا بحیثیت انسان بڑا ہی دردناک انجام اس آیۂ مبارکہ کے ذریعے سامنے آتا ہے: ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ﴾

لفظ ''انسان'' پر ''ال'' کی صورت میں جو حرفِ تعریف داخل ہوا ہے یہ بلا اختلاف ''لامِ جنس'' ہے۔ گویا یہاں ''اَلۡاِنۡسَان'' سے تمام کے تمام انسان اور پوری نوعِ انسانی مراد ہے۔ ''لَفِیۡ خُسۡرٍ'' کا عام طور پر ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ ''یقیناً خسارے میں ہے' گھاٹے میں ہے۔'' لیکن یہ بات جان لینی چاہئے کہ یہاں خسارے سے مراد کوئی دو چار لاکھ یا دو چار کروڑ کا خسارہ نہیں' بلکہ اس سے مراد ہے بربادی' تباہی اور ہلاکت۔ اسی لئے قرآن مجید اگرچہ کامیابی کے لئے متعدد الفاظ استعمال کرتا ہے' مثلاً فوز' فلاح' سعادت اور رشد وغیرہ' لیکن ان سب کی ضد قرآن مجید میں بالعموم ایک ہی لفظ ''خسران'' کو استعمال کرتا ہے: ﴿ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ﴾

سورۃ العصر میں نوعِ انسانی کے جس المیہ (human tragedy) کی طرف اشارہ ہو رہا ہے اسے دو مراتب میں سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلے درجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیاوی زندگی کے دوران محنت و مشقت ہر انسان کا مقدر ہے۔ مختلف اعتبارات سے تکالیف اور مصائب کے پہاڑ اس پر ٹوٹتے رہتے ہیں' کسی پر کم اور کسی پر زیادہ۔ نوعِ انسانی کی ایک عظیم اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جو دن بھر کی کمر توڑ دینے والی

محنت کرنے کے باوجود اپنے اور اپنی اولاد کے لئے زندگی کی بنیادی ضروریات بھی فراہم نہیں کر پاتے۔ اس پر مستزاد ہیں وہ صدمات کہ جن سے انسان دوچار ہوتا ہے۔ کبھی اولاد کی محبت اسے رلاتی ہے' کبھی مال کی تمنا اسے تڑپاتی ہے' کبھی ناکام آرزوئیں اس کے گلے کا ہار بنتی ہیں۔ طرح طرح کی مایوسیوں اور frustrations اور کئی نوع کی الجھنوں (conflicts) سے انسان دوچار ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نسیان اور بھول انسان کے لئے ایک بہت بڑی رحمت ہے۔ وقت کا مرہم انسان کے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ اس پر رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹتے رہتے ہیں لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بھلا دیتا ہے اور وہ اس طرح زندگی کا یہ سفر جیسے تیسے طے کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قلب حساس نوعِ انسانی کی اس کیفیت کا مشاہدہ کرے تو واقعہ یہ ہے کہ وہی صورت پیدا ہوگی جو گوتم بدھ کو درپیش ہوئی تھی' جس نے نوعِ انسانی کے اس المیہ کا مشاہدہ کر کے اپنا تاج و تخت اور سارا عیش و آرام تج کر اس بات پر کمر کس لی تھی کہ معلوم کرے گا کہ اس دکھ اور تکلیف کا اصل سبب کیا ہے' اور اس سے نجات پانے کی سبیل کون سی ہے! قرآن مجید نے ایک مقام پر اس تمام کیفیت کو نہایت جامعیت کے ساتھ یوں بیان فرمایا: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ﴾ (ترجمہ) ''ہم نے انسان کو محنت اور مشقت ہی میں پیدا کیا ہے۔'' یہ محنت و مشقت ہر انسان کا مقدر ہے۔[1]

ممکن ہے بعض لوگ اس مغالطے کا شکار ہوں کہ شاید دولت مند لوگوں کے لئے کوئی تکلیف نہیں' وہ آرام اور آسائش ہی میں رہتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس قسم کی ذہنی اذیتوں اور جس نوع کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے انہیں سابقہ پیش آتا ہے' بالعموم غرباء کو یا محنت کش لوگوں کو ان کا تجربہ بھی نہیں ہوتا۔

یہ تو تھا نوعِ انسانی کو درپیش المیے کا ابتدائی باب یا پہلا مرحلہ ـــــ انسانی المیے کا

---

(۱) غالب نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کی تعبیر بڑی خوبصورتی سے کی ہے ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

نقطۂ عروج (Climax) وہ ہوگا جب یہ ساری کمر توڑ دینے والی مشقتیں جھیل کر اور تمام تکلیفیں برداشت کر کے بالآخر انسان کی آنکھ اُس دوسری دنیا میں کھلے گی جہاں وہ اپنے آپ کو ایک بڑے محاسبے اور جواب دہی (Grand Accountability) کے لئے اپنے ربّ کے حضور کھڑا پائے گا۔ انسانی المیے کا یہ وہ پہلو ہے جو کسی حیوان کا مقدر نہیں ہے، کسی کولھو کے بیل یا کسی بار برداری کے جانور کو یہ کٹھن مرحلہ درپیش نہیں ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ﴾ (الانشقاق:٦) ''اے انسان! تجھے یہ تمام دکھ جھیلتے اور مشقتیں سہتے ہوئے بالآخر اپنے ربّ کے حضور میں جا حاضر ہونا ہے''۔ یہ وہ مرحلہ ہے کہ جس کے احساس ہی سے نسلِ انسانی کے کُل سر سبد کانپ کانپ جاتے رہے ہیں۔ سورۃ النور میں اس کی نقشہ کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے: ﴿یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ ''وہ (اہل ایمان) ڈرتے رہتے ہیں اس دن کے احساس اور اس دن کے خیال سے جس دن نگاہیں اور دل الٹ جائیں گے۔'' اسی احساس سے مغلوب ہو کر ابو بکر صدیق ؓ بڑے جذب کی کیفیت میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں درختوں پر چہچہاتی ہوئی ایک چڑیا ہوتا جس سے کوئی محاسبہ نہیں ہے، جسے کوئی جواب دہی نہیں کرنی، اور کاش کہ مَیں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے لیکن اسے کسی محاسبہ اور پوچھ گچھ کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ اسی سے ملتے جلتے الفاظ سورۃ النبأ کے اختتام پر وارد ہوئے ہیں کہ اُس روز کی سختیوں اور ہولناکی سے گھبرا کر انسان پکار اٹھے گا: ﴿یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا﴾ ''اے کاش کہ میں مٹی ہوتا'' (کاش کہ شرفِ انسانیت مجھے عطا نہ ہوتا)۔ یہ ہے نوعِ انسانی کا وہ المناک مقدر اور ہلاکت خیز نصیب جس سے پوری نوع کو بحیثیت مجموعی دوچار ہونا ہے اور یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ جس پر اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں قسم کھائی گئی ہے: ﴿وَالْعَصْرِ﴾۔

قسم کا فائدہ!

یہاں یہ بات جان لینی چاہئے کہ قسم سے اصل مقصود شہادت اور گواہی ہوتی

ہے۔ یعنی کسی کو اپنی بات پر گواہ کے طور پر پیش کرنے کے لئے اس کی قسم کھائی جاتی ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی بات پر اللہ کی قَسم کھاتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میں یہ بات اللہ کو گواہ بنا کر کہہ رہا ہوں۔ تو قَسم سے اصل مقصود شہادت ہے۔

قَسموں کے ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کسی عظیم ہستی کی قَسم کھاتا ہے۔ تبھی اس کے کلام میں زور اور تاکید کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی ہیں ان کا معاملہ مختلف ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ مقدس اور عظیم تر وجود کسی کا نہیں ہے لہٰذا قرآن مجید کی قَسموں میں تقدس اور عظمت کا پہلو تلاش کرنا ایک غیر ضروری بات اور ایک لاحاصل سعی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں جب کسی شے کی قَسم کھاتے ہیں تو وہاں محض گواہی پیش نظر ہوتی ہے۔ گویا ﴿وَالۡعَصۡرِ﴾ کا بامحاورہ ترجمہ ہوگا ''زمانہ گواہ ہے'' یعنی اگلی آیت میں جو حقیقت بیان کی جارہی ہے اس پر زمانے کو بطور گواہ کے پیش کیا گیا۔

''عصر'' کی حقیقت

لفظ ''الۡعَصۡرِ'' پر بھی غور کیجئے! ''عصر'' کا ترجمہ بالعموم ''زمانہ'' کیا جاتا ہے' لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ''زَمَان'' بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور وقت بھی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں لفظ ''زَمَان'' کا استعمال کہیں نظر نہیں آتا۔ البتہ ''وقت'' کا استعمال ایک دو مقامات پر مل جاتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں ''عصر'' اور ''دھر'' کے الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔

علم طبیعیات (Physics) سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ آج انسان کی رسائی اس حقیقت تک ہوئی ہے کہ زمان و مکان دو متضاد حقیقتیں نہیں' بلکہ ایک وحدت ہیں اور باہم مربوط ہیں' بلکہ جیسا کہ آئن سٹائن (Einstein) نے کہا کہ زمان (time) دراصل مکان (space) ہی کی ایک جہت (dimension) ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لفظِ عصر اور لفظِ دھر دونوں میں زمان و مکان کی وحدت کی طرف اشارہ موجود ہے۔ اگرچہ ان دونوں الفاظ میں ایک باریک سا فرق بھی ہے۔

لفظِ دھر میں زمانے کا پھیلاؤ اور اس کی مکانیت زیادہ پیشِ نظر ہے جبکہ لفظِ عصر میں اس کے مرور اور اس کی تیز رَوی کی جانب اشارہ ہے۔ عربی زبان میں تیز ہوا یعنی آندھی اور جھکڑ کو ''اعصار'' کہتے ہیں۔ اسی طرح دن کے اوقات میں عصر وہ وقت ہے جب دن تیزی سے ڈھل رہا ہوتا ہے' ختم ہوا چاہتا ہے۔

''وَالعصر'' کا حقیقی مفہوم

اس پس منظر میں اب ''والعصر'' کے مفہوم پر غور کیجیے! ترجمہ کچھ یوں ہوگا: ''تیزی سے گزرنے والا زمانہ گواہ ہے۔'' اس آیۂ مبارکہ میں بڑا چونکا دینے کا انداز ہے۔ انسان کو متوجہ کیا جارہا ہے کہ یہ وقت جو بظاہر ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے' درحقیقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ تمہاری اصل پونجی یعنی مہلتِ عمر تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ بقول شاعر ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

ایک صاحب نے بڑی عمدہ تشبیہہ دی ہے کہ انسان کی مثال برف کے تاجر کی سی ہے کہ جس کا مالِ تجارت اگر بروقت فروخت نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ منافع کا امکان باقی نہیں رہے گا بلکہ اُس کا اصل سرمایہ بھی پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ انسان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اس کی اصل پونجی مہلتِ عمر ہے۔ اس کے ابدی مستقبل کا دار و مدار اسی پر ہے۔ جو کمائی بھی اس نے کرنی ہے اسی وقفۂ حیات میں کرنی ہے۔ بقول اقبال ؎

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

بہر کیف انسان کی یہ اصل پونجی اور اصل سرمایہ برف کی مانند پگھلتا چلا جارہا ہے۔

یہی چونکا دینے کا انداز اس شعر میں بھی سامنے آتا ہے کہ ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

لفظ ''والعصر'' کے صوتی آہنگ اور صوتی کیفیت میں بھی چونکا دینے کی کیفیت موجود ہے ـــــ مزید غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ زمانہ ایک ایسی مسلسل چادر کی مانند ہے جو ازل سے ابد تک تنی ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ زمانہ مختلف قوموں کے عروج و زوال کا چشم دید گواہ ہے۔ نوعِ انسانی جن جن مراحل سے گزری ہے' جو جو حالات اس کو پیش آتے رہے ہیں' یہ سب گویا زمانے کے سامنے کی چیزیں ہیں۔ قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ اور قومِ صالحؑ کا جو انجام ہوا' قومِ لوطؑ اور قومِ شعیبؑ جس انجام سے دوچار ہوئے' آلِ فرعون جس طرح غرق ہوئے' ان تمام بڑے بڑے واقعات کا چشم دید گواہ یہ زمانہ ہے۔ اس زمانہ نے قوموں کو اُبھرتے اور گرتے بھی دیکھا ہے اور تمدنوں کو بنتے اور بگڑتے بھی دیکھا ہے۔ پھر یہ زمانہ قصۂ آدم وابلیس کا چشم دید گواہ بھی ہے اور یہی زمانہ انسان کے آخری انجام کا بھی عینی شاہد ہوگا۔ گویا اس پہلو سے بھی ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ﴾ پر جو سب سے بڑی گواہی پیش کی جا سکتی ہے وہ اسی زمانہ کی ہے۔ ﴿وَالْعَصْرِ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۝﴾

روشنی کی ایک کرن

اب تیسری آیت پر توجہ کو مرکوز کیجیے! یہ تیسری آیت مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن بن کر طلوع ہوتی ہے کہ اگرچہ بحیثیت مجموعی پوری نوعِ انسانی کا مقدر یہ ہے کہ وہ ہلاکت اور بربادی سے دوچار ہونے والی ہے لیکن اس قاعدۂ کلیہ میں ایک استثناء موجود ہے' اس خسارے سے نجات کی ایک صورت ممکن ہے۔ اس تیسری آیت میں انسان کی رہنمائی ایک صراطِ مستقیم کی جانب کی گئی ہے کہ جس پر چل کر وہ اپنے آپ کو اس ہلاکت خیز انجام سے بچا سکتا اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

اس صراطِ مستقیم یا سواء السبیل کے چار سنگ ہائے میل (mile stones) ہیں' یا یوں کہیے کہ اس کی چار منزلیں ہیں۔ اوّلین منزل ہے ایمان' دوسری ہے عمل صالح' تیسری ہے تواصی بالحق اور چوتھی ہے تواصی بالصبر۔

یہاں قرآن مجید نے جس انداز میں ان چار اصطلاحات کو بیان کیا ہے اور اُس کے لئے اس نے جو الفاظ اختیار کئے ہیں تو واقعتاً انہوں نے قرآن مجید کی بنیادی اصطلاحات کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان پر بطریق تدبر غور کرنے کے لئے ان کو دو دو کے دو جوڑوں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا۔ ہم پہلے ایمان اور عمل صالح اور ان دونوں کے باہمی تعلق پر غور کریں گے' پھر تواصی بالحق اور تواصی بالصبر اور ان کے باہمی رشتے پر توجہات کو مرکوز کریں گے اور پھر ان دونوں جوڑوں کے مابین موجود عقلی اور منطقی ربط کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

''ایمان'' کا مفہوم

جہاں تک ''ایمان'' کے تفصیلی مباحث کا تعلق ہے' یعنی یہ کہ اس کا لغوی مفہوم کیا ہے' اس کا اصطلاحی مفہوم کیا ہے' ایمان کن کن امور کو ماننے کا نام ہے' اس دولت کے حصول کے ذرائع کون کون سے ہیں وغیرہ' تو یہ ان شاء اللہ اس ''منتخب نصاب'' میں اپنے مناسب مقام پر آئیں گے۔ یہاں صرف یہ جان لینا ضروری ہے کہ ایمان درحقیقت نام ہے اس کائنات کے بارے میں اُن بنیادی حقائق کو تسلیم کرنے کا جن کی خبر دی ہے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے۔ انبیاءؑ ہمیں بتاتے ہیں کہ اس کائنات کے ان اصل اور اساسی حقائق تک' جو عام انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں' ان کی رسائی ایک ایسے ذریعۂ علم کے واسطہ سے ہوئی ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں' یعنی ''وحی۔'' حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود' اس کی صفاتِ کمال' بعث بعد الموت' حساب کتاب' جزا و سزا اور جنت و دوزخ' یہ وہ امور ہیں کہ جن تک رسائی انسان اپنے حواس کے ذریعے سے حاصل نہیں کر سکتا۔ ان حقائق کے بارے میں حتمی خبر ہمیں انبیاء کرام علیہم السلام نے دی ہے۔ ان کی دی ہوئی خبروں کی تصدیق کرنے اور ان کو تسلیم کر لینے کا نام ایمان ہے۔

ایمان کے دو درجے ہیں —— ایک درجہ یہ ہے کہ زبان سے ان باتوں کو مان لیا جائے۔ اسی کو ''اقرارٌ باللّسان'' کہا جاتا ہے۔ یہ ایمان کا اوّلین یا یوں کہئے کہ

قانونی درجہ ہے کہ جس نے زبان سے ان حقائق کو مان لیا گویا وہ ان لوگوں سے ممیّز ہو گیا جو ان امور کو نہیں مان رہے۔

ایمان کا دوسرا درجہ "تصدیقٌ بالقلب" ہے۔ یعنی وہ کیفیت کہ ان امور پر ایک پختہ یقین قلبِ انسانی میں پیدا ہو جائے۔ ایمان کی اصل روح یہی ہے۔ گویا ایمان فی الحقیقت اقرارٌ باللّسان اور تصدیقٌ بالقلب کے مجموعے کا نام ہے۔ قلبی یقین کے نتیجے میں انسان کا عمل لازماً متاثر ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر کسی بات پر انسان کو یقین ہو تو اس کا عمل اس کے خلاف نہیں ہو گا۔ ہمیں یقین ہے کہ آگ جلاتی ہے۔ ہم آگ میں ہاتھ ڈالنے کے لئے تیار نہیں! بلکہ یقین تو دُور کی بات ہے، بسا اوقات محض ظن بھی انسان کے عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے، لیکن محض اس ظن کی بنیاد پر کہ شاید یہ سانپ جس سے ہمیں سابقہ پیش آیا ہے زہریلا ہو، ہم ہر سانپ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر دل میں اللہ کا یقین ہو، آخرت کا یقین ہو، جزاوسزا اور محاسبۂ اُخروی کا یقین ہو تو اس کا ایک نتیجہ لازماً مترتب ہوتا ہے۔ اور وہ نتیجہ ہے کہ جسے قرآن "عمل صالح" کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا عمل درست ہو جائے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل پیرا ہو گا، حلال پر اکتفا کرے گا، حرام سے اجتناب کرے گا، معصیت کے قریب نہیں پھٹکے گا۔ یہ تمام کیفیاتِ حقیقی ایمان کے نتیجے میں لازماً پیدا ہوں گی۔

ایمان اور عمل صالح کا باہمی تعلق

یہ بات جان لینی چاہئے کہ ایمان اور عمل صالح قانون کے درجے میں اگرچہ دو جداگانہ حقیقتیں ہیں لیکن حقیقت کی سطح پر یہ دونوں ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ یہ اس طرح باہم لازم وملزوم ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں! یہ ہے وہ بات جو نبی اکرم ﷺ کی متعدد احادیث کے ذریعے وضاحت سے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں، جسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، حضور ﷺ کے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ))

''کوئی زانی حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا' کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا' کوئی شرابی حالت ایمان میں شراب نہیں پیتا۔''

جس وقت کوئی شخص یہ کام کرتا ہے وہ دلی یقین کسی سبب سے زائل ہو چکا ہوتا ہے۔ اگر وہ دلی یقین موجود ہوتا تو ان افعال کا صدور ممکن نہ ہوتا۔ جب ہم چوراہے پر کسی ٹریفک کانسٹیبل کو کھڑا دیکھتے ہیں تو بلا ارادہ بھی ہماری گاڑی ٹھیک جگہ پر جا کر رک جاتی ہے' اس لئے کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہاں کے نظم و نسق کا محافظ اور ذمہ دار شخص ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ یقین ہو کہ اللہ موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ میں اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی کروں۔

ایمان اور عمل کا باہمی لازم و ملزوم کا تعلق ایک اور حدیث مبارکہ سے بھی سامنے آتا ہے۔ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ' وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ' وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ))

''خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لرز اٹھے ہوں گے۔ انہوں نے بہت ڈرتے ہوئے سوال کیا: ''لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟'' کہ حضور! یہ آپ کس کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟ جواباً آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ)) (متفق علیہ)

''وہ شخص کہ جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی امن میں نہیں۔''

یہ ہے تعلق ایمان اور عمل صالح کا' اور یہ ہے تعلق ایمان اور اخلاقِ صالحہ کا۔ ایک اور حدیث میں جو آپ ﷺ کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' آپ ﷺ کے مندرجہ ذیل الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فَلَمَّا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ: ((لَا اِیْمَانَ لِمَنْ

لَآ اَمَانَۃَ لَہٗ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَّآ عَھْدَ لَہٗ)) (متفق علیہ)

''شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہو گا کہ حضور ﷺ نے کوئی خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں آپ ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد نہ فرمائے ہوں: ''جس شخص میں امانت نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں ہے اور جس میں ایفاءِ عہد نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے۔''

معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان اگر حقیقی اور فی الواقع قلبِ انسانی میں جاگزیں ہو گیا ہو تو ممکن نہیں ہے کہ انسان کی سیرت و کردار میں اس کی جھلک نظر نہ آئے۔ ایک اعتبار سے یہ وہی بات ہے جو سقراط نے کہی تھی کہ علم نیکی ہے اور جہالت بدی ہے۔ ایمان نام ہے علم حقیقت کا۔ انسان کے عمل کی درستی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

''تواصی'' کا مفہوم

اب آیئے آخری دو الفاظ کی طرف، یعنی ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ ــــــ الفاظ کے اس جوڑے میں لفظ ''تَوَاصَوْا'' دوبار آیا ہے۔ مناسب ہو گا کہ پہلے اس پر غور کر لیا جائے! یہ لفظ ''وصیت'' سے بنا ہے اور وصیت عربی زبان میں ہر اُس بات کو کہتے ہیں جو تاکید کے ساتھ کہی جائے۔ اردو زبان میں صرف کسی شخص کے انتقال کے وقت کی کہی ہوئی باتوں کو وصیت کہا جاتا ہے، لیکن عربی میں اس کا اطلاق ہر ایسی بات پر ہوتا ہے جو کسی بھی موقع پر تاکیداً کہی جائے۔ یہاں اس سورۂ مبارکہ میں یہ لفظ بابِ تفاعل میں آیا ہے۔ ''تواصی'' باب تفاعل سے مصدر ہے، اور اس باب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ آتے ہیں ان میں ایک تو مبالغے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، یعنی کسی کام کو اہتمام کے ساتھ سرانجام دینا، اور دوسرے ان میں شراکت کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ یعنی باہم مل جل کر کسی کام کو سرانجام دینا۔ تو ''تواصی'' کا مفہوم یہ ہو گا کہ انتہائی اہتمام کے ساتھ باہم ایک دوسرے کو کسی بات کی تلقین کرتے رہنا۔ یہ تلقین ''حق'' کی بھی ہو گی اور ''صبر'' کی بھی۔ ﴿وَتَوَاصَوْا

بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾

''حق'' ـــــ ایک وسیع المفہوم لفظ

''حق'' عربی زبان کا ایک وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس کے چار بنیادی مفاہیم بیان کیے جاتے ہیں: (۱) ہر وہ شے حق ہے جو فی الواقع موجود ہو۔ اس کے برعکس جو شے حقیقتاً موجود نہ ہو بلکہ محض سراب کی مانند نظر آ رہی ہو' اسے باطل کہا جائے گا۔ (۲) اسی طرح ہر وہ شے حق ہے جو عقلاً مسلّم ہو (۳) جو اخلاقاً واجب ہو' اور (۴) اسی طرح وہ شے بھی حق کہلائے گی جس میں کوئی مقصدیت پائی جائے۔

یہاں قرآن مجید نے لفظ ''حق'' استعمال کر کے تواصی بالحق کے مفہوم کو انتہائی وسعت دی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی حقیقت کے اعتراف و اعلان اور اُس کی تلقین اور تبلیغ سے لے کر اس کائنات کے بڑے سے بڑے حقائق کا ادراک و اعتراف اور ان کی تلقین و تبلیغ' یہ سب چیزیں تواصی بالحق میں شامل ہوں گی۔ گویا اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی کچھ رقم جو اُس کے ذمے قرض تھی' ادا نہ کر رہا ہو اور آپ جا کر اس سے کہیں کہ بھلے آدمی! فلاں کی رقم واپس کر دو تو یہ بھی تواصی بالحق میں شامل ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ نے کسی ایسے بچے کو جو اپنے والدین کے حقوق ادا نہیں کر رہا' یہ تلقین کی کہ اپنے والدین کا ادب کیا کرو' ان کا کہنا مانا کرو تو یہ بھی تواصی بالحق ہی کی ایک شکل ہے۔ اسی طور پر اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا اعلان و اعتراف کہ اللہ ہی خالق اور مالک ہے' اس کا حق ہے کہ اسی کی اطاعت کی جائے' اس کا حق ہے کہ اسی کا قانون نافذ ہو' تواصی بالحق کی بلند ترین منزل ہے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر لازم و ملزوم

تواصی بالحق کے ساتھ جڑا ہوا لفظ ہے ''تواصی بالصبر'' ـــــ یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ (اَلْحَقُّ مُرٌّ)۔ اگر حق کی کوئی چھوٹی سی بات بھی کہی جائے تو بالعموم مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ میں نے مثال دی تھی کہ کسی شخص کو اگر کسی دوسرے شخص کا قرض ادا کرنا ہو اور آپ اس سے کہیں کہ بھلے آدمی اس کی رقم ادا

کردو، تو عین ممکن ہے کہ آپ کو یہ تیز وتند جواب ملے کہ آپ کون ہوتے ہیں ہمارے معاملے میں دخل دینے والے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ حق کی کسی چھوٹی سی چھوٹی بات کا اعلان بھی آسان نہیں ہے۔ اس راہ میں لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا۔ بالخصوص بڑے حقائق کے اعلان، ان کی تبلیغ اور ان کی اشاعت تو بہت ہی صبر آزما کام ہے۔

یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان ہر نوع کے مصائب جھیلنے کے لئے ذہناً تیار ہو جائے اور جان لے کہ جس کام کا اس نے عزم کیا ہے وہ کانٹوں بھرا بستر ہے، پھولوں کی سیج نہیں!

ایمان اور عمل صالح کا تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے ربط

اب تک ہم نے سورۃ العصر میں بیان شدہ نجات کی چار شرائط کو دو دو کے دو جوڑوں میں تقسیم کر کے دیکھ لیا ہے کہ ایک طرف ایمان اور عمل صالح لازم وملزوم ہیں اور دوسری طرف تواصی بالحق اور تواصی الصبر بھی باہم لزوم رکھتے ہیں۔ اب ان دو جوڑوں کے مابین جو رشتہ اور تعلق ہے اسے بھی سمجھ لیں تو بات پوری ہو جائے گی۔

یہ فطرت کا عام اصول ہے کہ کوئی شے نہ ماحول سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتی ہے نہ اسے متأثر کئے بغیر۔ برف میں جو خنکی ہے وہ اپنے ماحول میں لازماً سرایت کرے گی اور آگ کی حرارت اپنے ماحول کو لازماً گرم کر دے گی۔ یہی معاملہ اخلاقیات کے میدان میں ہے۔ اگر کسی انسان میں عمل صالح حقیقتاً پیدا ہو جائے تو وہ لازماً ماحول میں اثر ونفوذ کرے گا اور اس سے نیکی اور بھلائی لازماً پھیلے گی۔ گویا عملِ صالح کا فطری نتیجہ تواصی بالحق ہے۔

انسانی اخلاقیات میں یہ اصول اور بھی شدت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی ماحول خراب ہے تو اس کی خرابی لازماً افراد کی زندگیوں میں سرایت کرے گی۔ اور اس سے بچنے کی ایک ہی راہ ممکن ہے کہ ماحول کو تبدیل کر دیا جائے یا کم از کم اس کو تبدیل کرنے کی جدوجہد مسلسل جاری رکھی جائے۔ اس طرح اگر ماحول نہ بھی تبدیل ہو تو کم از کم وہ فرد ''جارحیت بہترین دفاع ہے'' (Offence is the best

(defence) کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اپنا دفاع ضرور کرے گا۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (مسلم)

"تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ اسے بزورِ بازو (نیکی سے) بدل دے، پھر اگر اس کی قوّت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ضرور منع کرے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل سے ضرور مدافعت کرے (یعنی دل میں ضرور بُرا جانے اور اس کو نہ روک سکنے پر متاسف ہو) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

پھر تواصی بالحق انسان کی شرافت کا بھی لازمی تقاضا ہے۔ اس لئے کہ جو حق کسی انسان پر منکشف ہوا ہے اور جسے خود اس نے اختیار کیا ہے اس کی انسان دوستی کا لازمی تقاضا ہے کہ اسے دوسروں کے سامنے بھی پیش کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ انسان اس سے نفع اندوز ہوں اور اس کی برکتوں سے متمتع ہو سکیں۔ اسی لئے آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) (صحیح البخاری) یعنی تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں قرار پا سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔

اور آخری درجہ میں یہ انسان کی غیرت اور حمیت کا تقاضا بھی ہے کہ جس حق کو اُس نے خود قبول کیا ہے اس کا پرچار کرے، اس کا مبلغ اور علم بردار بنے اور اس کا بول بالا کرنے کے لئے تن من دھن سے جدوجہد کرے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر انسان ایک خاص طرز کو اختیار کرتا ہے اور ماحول کسی اور رنگ میں رنگا ہوا ہے تو فطری طور پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کے مطابق خود بھی ماحول ہی کے رنگ میں رنگا جائے تاکہ دوئی ختم ہو جائے اور تصادم باقی نہ رہے، اور دوسرے یہ کہ ع "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!" کی روش اختیار کر کے اور ماحول سے ٹکر لے کر اسے اپنے رنگ میں

رنگنے کی کوشش کرے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک شریف' باوقار' غیور اور باحمیت انسان تو صرف ایک ہی راہ اختیار کر سکتا ہے اور وہ دوسری ہے نہ کہ پہلی۔ وہ اس کو تو گوارا کر لے گا کہ ''بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھو سکا!'' کے مصداق اپنی جان دے دے' لیکن اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ تن آسانی اور عافیت کوشی کی راہ پر چل کر حق سے غداری کا مرتکب ہو جائے۔

الغرض ــــ جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو نظر یہی آتا ہے کہ ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ایک جانب تو نجات کے ناگزیر لوازم ہیں اور دوسری جانب خود باہم لازم وملزوم ہیں' بلکہ ان چاروں پر علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر غور کرنے سے جو حقیقت منکشف ہوئی وہ یہ ہے کہ یہ چاروں ایک ہی وحدت کے ناقابل تقسیم پہلو ہیں اور ایک ہی کل کے اجزائے غیر منفک ہے۔ گویا ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' بقول اقبال مرحوم ع ''یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایمان کی تفسیریں''۔ ایمان اگر حقیقی ہو جائے تو اس سے عمل صالح ضرور پیدا ہوگا۔ اور عمل صالح اگر پختہ ہو جائے تو لازماً تواصی بالحق پر منتج ہوگا۔ اور تواصی بالحق اگر واقعی اور حقیقی ہے تو تواصی الصبر کا مرحلہ لازماً آ کر رہے گا' یہاں تک کہ اس کی عکسی صورت (Converse proposition) بھی بالکل درست ہے۔ یعنی یہ کہ تواصی بالصبر کا مرحلہ نہیں پیش آیا تو یہ قطعی ثبوت ہے اس کا کہ دعوت پورے حق کی نہیں ہے' بلکہ اس کے صرف کسی بے ضرر سے جزو کی ہے' اور اگر دعوت کا مرحلہ نہیں آتا تو یہ حتمی ثبوت ہے اس کا کہ انسان کا اپنا عمل صحیح اور پختہ نہیں ہے' اور اگر عمل درست نہیں ہو رہا تو یہ یقینی ثبوت ہے اس کا کہ ایمانِ حقیقی ہی موجود نہیں۔

گویا سورۃ العصر نجات کی جس شاہراہ کی طرف راہنمائی فرماتی ہے اور انسانی کامیابی کے لئے جس صراطِ مستقیم کی نشان دہی کرتی ہے اس کے چار سنگ ہائے میل ہیں۔ پہلا ایمان' دوسرا عمل صالح' تیسرا تواصی بالحق اور چوتھا تواصی بالصبر۔

ایک کامل مثال — اُسوۂ محمد ﷺ

اس کی کامل اور مکمل مثال ہے آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ، جس میں یہ چاروں چیزیں اپنی بلند ترین شان کے ساتھ بتمام وکمال موجود ہیں۔

حضور ﷺ نے سب سے پہلے اپنی اور کائنات کی حقیقت پر مطلع ہونا چاہا اور جب از روئے ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾ جبریل امین نے حقائق کا کامل انکشاف کیا تو اس کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۲۸۵) ''ایمان لایا رسول اُس پر جو نازل کیا گیا اُس پر اُس کے ربّ کی جانب سے اور ایمان لائے اہل ایمان۔''

دوسری طرف آپ کی زندگی اخلاقِ حسنہ کا کامل نمونہ اور خلق عظیم کا شاہکار تھی۔ جیسے کہ فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم: ۴) یعنی آپ یقیناً نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

ایمان اور عمل صالح کے ان بنیادی تقاضوں کو بتمام وکمال پورا کرنے کے بعد پھر مسلسل تئیس برس حضور ﷺ نے حق کی دعوت اور ذاتِ سبحانہ وتعالیٰ کی کبریائی کے اعلان و نفاذ کی اَن تھک جدوجہد میں صرف کئے اور اس راہ میں ہر تکلیف سہی، ہر مصیبت کو برداشت کیا، ہر مشکل کو جھیلا اور ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ چنانچہ شعب بنی ہاشم میں تین سال کی شدید ترین قید کی صعوبت بھی سہی، طائف کے بازاروں میں اوباشوں کی فقرہ بازی اور سنگ باری بھی برداشت کی، بدر اور اُحد میں خود اپنے دندانِ مبارک کے علاوہ اپنے قریب ترین اعزّہ اور عزیز ترین جاں نثاروں کی جانوں کا ہدیہ بھی بارگاہِ ربّانی میں پیش کیا اور تئیس برس کی شبانہ روز محنت اور مشقت سے بالآخر حق کا بول بالا کر دیا اور خدا کے دین کو جزیرہ نمائے عرب میں غالب کر کے ہی رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت اختیار فرمائی۔ فصلی اللّٰہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وسلّم تسلیماً کثیراً کثیراً۔ گویا آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ سورۃ العصر کی مجسم

تفسیر ہے! فداہ ابی وامی۔

تو حضرات! یہ ہے سورۃ العصر کے مفہوم کی مختصر تشریح۔ اب آپ کو اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کیوں میں نے اسے قرآن مجید کی جامع ترین سورت قرار دیا تھا۔ اور کیوں امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اگر لوگ غور و فکر سے کام لیں تو تنہا یہی مختصر سورت ان کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی ہے۔

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاھور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر **تشہیر و اشاعت ہے**

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـ اور ـ **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ